محمد امجد عابد
لیکچرر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور

ڈاکٹر سید قاسم جلال کی تنقید اور عصری شعور

Muhammad Amjad Abid
Lecturer Department of Urdu, University of Education, Lower Mall Campus, Lahore

Criticism and modern consciousness of Dr. Syed Qasim Jalal

"Contemporary Conciousness" is such a feeling that occures because of social changes on the mind and heart of a creator and indirectly comes under the discussion of a critic. Dr. Syed Qasim Jalal is a renowned researcher, critic and poet. Being a critic he has also had a deep relation with society. He, in his criticism, has given the proof of contemporary awareness in the light of contemporary situation along with social awareness. He puts a critical eye on social life of his age. In this essay given, his use of contemporary conciousness is indicated.

تنقید (Criticism) ایک وسیع تر اصطلاح ہے جس کا دائرہ معاشرے سے لے کر انسان کے افعال و اعمال، اس کے رویّوں، رجحانات اور میلانات تک پھیلا ہوا ہے جس میں ہم حالات کے نشیب و فراز اور ماحول کے سرد و گرم کا جائزہ لے کر جہت اور سمت کے تعین کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ادب کے حوالے سے جب ہم تنقید کی اصطلاح پر غور کرتے ہیں تو اس کا ایک مخصوص تناظر ہمارے سامنے آتا ہے جس میں ادبی تنقید کی مختلف صورتیں اور پہلو عیاں ہوتے ہیں۔

تنقید در اصل ایک احتساب کا عمل ہے جس میں ادب یا کسی شے کی ماہیت کا جائزہ لے کر اس کی بنیادوں کو زیرِ غور لایا جاتا ہے۔ مثلاً ادبی تنقید سے الگ جب ہم معاشرے، انسان اور اس کے اعمال و افعال کو زیر بحث لاتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس معاشرے کی ماہیت کیا ہے اور اس کی تشکیل و ترتیب میں کون سے

عوامل کار فرما رہے ہیں؟ یہی صورت انسان اور اس کی زندگی کے متعلقات کی ہے کہ ایک معاشرے میں رہتے ہوئے انسان نے کس نوع کے طرزِ عمل کو اختیار کیا ہے اور وہ کس حد تک معاشرتی اصولوں، اس کی روایات اور اس کے رسوم و رواج پر کار بند ہے۔ اس بات کا جائزہ بھی تنقید کے دائرے میں شامل ہے کہ انسان کو جس ڈھب پر زندگی گزارنے کے مواقع میسّر ہیں وہ کس حد تک ان کے تقاضے پورے کر رہا ہے اور کس حد تک منفی جہت کو اختیار کیے ہوئے ہے۔

تنقید ہی وہ آلہ ہے جس کے ذریعے معاشرے اور انسان کے مثبت طرز عمل کی تحسین اور منفی اندازِ زیست کی تنقیص کی جاتی ہے اور یوں معاشرہ اور انسان خود آگاہی کی منزل سے گزر کر اپنے بیش و کم کو توازن میں لا سکتا ہے۔ گویا تنقید ایک مثبت معاشرے کے قیام اور بہتر انسان کی نمود کے لیے ایک مثبت کردار کی حامل ہے۔ ادبی تنقید اپنی محدود سطح پر ادب، معاشرے اور فرد کی صورتِ حال کا جائزہ لیتی ہے اور ہر آن ایک نئے زاویے اور جہت سے اپنا تعارف کرواتی ہے اور ادب کے مثبت اور منفی اندازِ زیست کی نقاب کشائی کرتی ہوئی موجودہ دور میں کئی اہم اور بنیادی تبدیلیوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ جدید دور میں جن نقادوں کے کندھوں پر ماضی کے ورثے کی گراں باری بھی ہے، حال کی المیاتی صورت بھی اور گہری دھند میں لپٹا ہوا مستقبل بھی اُن میں سید قاسم جلال کا نام نمایاں ہے۔

سید قاسم جلال (۱۹۴۸ئ) نے مختلف حیثیتوں سے اُردو ادب میں شہرت حاصل کی۔ وہ بیک وقت ایک محقق، نقاد اور شاعر ہیں۔ اُنھوں نے ادب کی مختلف جہتوں پر کام کیا ہے اور فکر انگیز مضامین کے ذریعے بہت سے ایسے گوشوں کو نمایاں کیا ہے جو اس سے پہلے پردے میں تھے۔ سید قاسم جلال کی شاعرانہ حیثیت الگ سے اُن کے تخلیقی طرزِ احساس کا پتا دیتی ہے۔ انھوں نے تحقیق اور تنقید کے میدان میں بھی تخلیقی ہنر آزما کر اُن کے بارے میں مروجہ تصورات کو بدل دیا ہے۔ اُن کا تنقیدی شعور اُن کی تخلیقات میں نمایاں نظر آتا ہے۔ بے لاگ تنقید اُن کا خاصا ہے جس میں کبھی وہ اظہار حق سے روگردانی نہیں کرتے۔ ان کی تنقیدی نگاہ قاری کو فکر و فن کے نئے گوشوں اور زاویوں سے روشناس کراتی ہے۔ اُن کی تنقیدات میں گہرائی، وسعت اور ایک فکری رچاؤ نظر آتا ہے۔ اُن کی تنقیدی کتب میں ''ادبی تجزیے''، ''کھوج پرکھ''، ''رئیس امروہوی۔ احوال و آثار''، ''تنقید و تنقیح'' اور ''توجیہ و توضیح'' شامل ہیں۔ اپنی ان تنقیدی کتب میں انھوں نے مختلف اصنافِ سخن اور شخصیات مثلاً اردو غزل، اردو نظم، اردو مرثیہ، قطعہ نگاری، اردو افسانہ نگاری اور شاعروں اور نثر نگاروں کے فکر و فن پر قلم اٹھا کر ان کی فکری اور فنی بنیادیں تلاش کی ہیں۔ اُن کی تحریروں میں وسعتِ مطالعہ، حقیقت پسندی، جدت

پسندی اور اسلوب کی عمدگی کے عناصر ملتے ہیں۔ ان کی فکری بالغ نظری اور ذہنی اُپج کا اظہار و اقرار اُن کے لیے رقم کیے گئے اربابِ قلم کے رشحات سے بہت نمایاں ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ماہ نامہ ''سنہرا'' اور ماہنامہ '' رشحات'' کے دو ضخیم ''ڈاکٹر سید قاسم جلال نمبر''عصر حاضر کی گواہی بن کر ان کی تنقید و تحقیق کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے ایسا تنقیدی اسلوب اختیار کیا ہے جو تخلیق کے حسن سے مملو ہو گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی:

''ڈاکٹر سید قاسم جلال کے تنقیدی مقالات پڑھ کر احساس ہوا کہ ان میں تخلیقی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وہ بڑے سچے جذبے سے تخلیق کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ تنقید ہی نہیں کرتے بلکہ علمی و ادبی مسائل کا تجزیہ بھی کرتے ہیں...وہ ادبی مسائل کی نوعیت سے واقف ہیں اس لیے وہ جو بھی مشورے دیتے ہیں وہ صائب ہوتے ہیں۔ ان کی فکر میں گہرائی ہے۔ زندگی کی پیچیدگیوں سے واقف ہیں۔ اس لیے وہ شاعر یا نثر نگار کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں...نہ کوئی حکم صادر کرتے ہیں نہ جارحانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ وہ اپنی بات کی وضاحت کے لیے دلائل کا سہارا لیتے ہیں۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ وہ اپنی رائے کا ابلاغ کر سکتے ہیں۔''[1]

ان سطور کی روشنی میں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قاسم جلال اپنی تنقید میں کس طرح فن پارے کی گہرائی میں اتر کر اس کی مختلف اطراف اور جہات سے جائزہ لیتے ہیں اور غیر جانب دار ہو کر اصل حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فن پارے کا جائزہ لیتے ہوئے وہ فن پارے کی گہرائی کو ماپنے کے ساتھ ساتھ ان ادبی رویوں اور تحریکوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو مختلف انداز میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ادب پارے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

سید قاسم جلال کا تنقیدی رویہ مثبت انداز کا حامل ہے وہ بنیادی طور پر صداقت کے علمبردار ہیں۔ تاہم اصل بات یہ ہے کہ وہ تخلیق کار کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں۔ بعض اوقات وہ موازنے اور مقابلے سے بھی کام لیتے ہیں اور یوں تخلیق کار کے مقام کے تعین کا مشکل فیصلہ بھی کرتے ہیں تاہم اس میں وہ اپنی روایات کا خاص خیال رکھتے ہیں اور متوازن انداز میں فن پارے کے حسن و قبح کو سامنے لاتے ہیں۔ ان کی تنقید کا ایک اہم پہلو اس کا نیا پن ہے۔ وہ اپنی تنقید کے لیے ایسے موضوعات منتخب کرتے ہیں جو اس سے پہلے ہمارے ناقدین کی نظروں میں نہیں رہے یا اگر یہ موضوعات ان کے زیر مطالعہ آئے بھی ہیں تو انھوں نے اس طرح انہیں نہیں جانچا جیسے سید قاسم جلال نے انھیں جانچنے کی سعی کی ہے۔ موضوعات کا یہی نیا پن ہمیں سید قاسم جلال کی انفرادیت کا پتہ دیتا ہے جس کی تہہ میں ان کا سماجی شعور پنہاں ہے ان کی خوبی یہ ہے کہ ایک تو انھوں نے اپنی

تنقید کے لیے اپنے ہی عہد کے تخلیق کاروں کو ترجیح دی ہے دوسرے انھوں نے ان تخلیق کاروں اور ان کی تخلیقات کو اپنے عہد کی سماجیات کے تناظر میں رکھ کر دیکھا ہے۔ان کا یہ سماجی رخ اس حد تک واضح اور نمایاں ہے کہ تخلیق کار کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقات بھی آئینہ ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ڈاکٹر عبد الکریم خالد نے سید قاسم جلال کو مولانا حالی کے سلسلے کا نقاد قرار دیا ہے۔اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''ان کی تنقید کے پس پردہ وہی روح کام کر رہی ہے جس کے احیا کے لیے مولانا حالی نے آواز اٹھائی... قاسم جلال نے تنقید میں باقاعدہ نظریہ سازی کا روگ تو نہیں پالا لیکن یہ نظریہ سازی لاشعوری طور پر ان کی شخصیت اور ماحول کے تال میل سے انجام پاتی ہے جو ان کی شعری تخلیقات اور تنقید دونوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔''۲

اس اقتباس کی روشنی میں ہم بخوبی یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ قاسم جلال کا نظریۂ تنقید وہی ہے جو مولانا حالی نے قائم کیا ہے جو ایک اعلیٰ ترین مقصد کی سمت نمائی کرتا ہے۔ان کا یہ نظریہ انسان کے اندر سے ابھرنے والی وہ آواز ہے جو اُسے عرفانِ ذات سے عرفانِ حق کے راستے پر لے جاتی ہے اور اس میں ایک کھرا پن پایا جاتا ہے جو ہر قسم کی آلائش سے پاک ہے۔

سید قاسم جلال ایک جرأت مند اور بے باک نقاد ہیں اور کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر جرأت مندی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے یہاں بھی جو باتیں پسند نہیں آتیں ان کا برملا اظہار کر دیتے ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر طاہر تونسوی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر سید قاسم جلال کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ بعض دیگر محققین کی طرح غیر ضروری خردہ گیری سے پرہیز کرتے ہیں۔ایک متوازن فکر کے حامل نقاد کی حیثیت سے اپنی صاف ستھری اور جچی تلی رائے کا برملا اظہار کر دیتے ہیں۔''۳

اس اقتباس کی روشنی میں جہاں سید قاسم جلال کی جرأت رندانہ کا پتہ چلتا ہے وہاں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ بقول طاہر تونسوی غیر ضروری خردہ گیری سے پرہیز کرتے ہیں۔یہ ایک نہایت اہم بات ہے۔ہمارے ہاں ایسے نقادوں کی کمی نہیں جو دوسروں کے بنے بنائے نظریات پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھتے اور ماخذ کا ذکر کیے بغیر ان نظریات پر اپنا حق جتاتے ہیں۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نقاد اپنے نظریاتی طرزِ عمل میں منافقت کا مظاہرہ کرتا ہے اور دوسروں کے وضع کردہ نظریات پر ہاتھ صاف کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔اس سلسلے میں سید قاسم جلال واضح اور دوٹوک نظریے کے حامی ہیں۔سب سے بنیادی بات تو یہ ہے کہ وہ جن صالح روایات کے امین ہیں اس

کے اظہار میں کسی طرح کے احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوتے اور واضح طور پر یہ نقطہ نظر اختیار کرتے ہیں کہ آج کے دور میں ان قومی اور تہذیبی روایات کی ضرورت ہے جو ہمارے قومی اور تہذیبی تشخص کی علامت ہیں اور اس سے انحراف ایک بحرانی کیفیت پیدا کرنے کا باعث ہے۔ اس سلسلے میں ان کے یہاں علامہ اقبال کے افکار کو ترجیح حاصل ہے۔ چنانچہ وہ ادیبوں کی جدید نسل سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کلاسیکی روایات کو شجر ممنوعہ سمجھنے اور جدید ترین بننے کے شوق میں اپنی اعلیٰ اقداری روایات کو پامال نہ کریں۔ اس سلسلے میں یہاں قاسم جلال کے تنقیدی مضمون سے ایک اقتباس ہمارے اس خیال کی وضاحت کرے گا۔ وہ لکھتے ہیں:

''موجودہ دور کے اکثر شعرا نے متوازن شعور کو چھوڑ کر سطحی جذباتیت کو اپنے فن کی بنیاد بنالیا ہے۔ مثبت اقدار کو شجرِ ممنوعہ قرار دینے سے جہاں نیم پختہ و بے روح سوچوں نے معنویت و خیال آفرینی کا خون کیا ہے وہاں کُھردرے اور نامانوس اسلوبِ بیان نے شاعری سے جمالیاتی رنگ اور فنی شائستگی کیقیمتی خزانےچھین لیے ہیں۔ معمّہ نما پُر ابہام نظموں اور پیچیدہ مہمل موضوعات کی حامل غزلوں سے آج کے جدّت زدہ شاعر کی داخلی بحرانی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔''[۴]

سید قاسم جلال کی یہ سطور جہاں دردمندی کے احساس کو اجاگر کرتی ہیں وہاں موجودہ دور میں ادب کی بحرانی کیفیت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ یہ بات اپنے عہد کے سماجی شعور کے بغیر لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ یہی سماجی شعور آگے چل کر عصری شعور کی بنیاد بنتا ہے۔ سید قاسم جلال جب جدّت زدہ شاعروں کی داخلی بحرانی کیفیت کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر ہمارے وہ سماجی رویے ہیں جو شاعر کے ذہن پر اثر انداز ہو کر اس داخلی بحرانی کیفیت کو پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ چنانچہ اس ہیجان پرور معاشرے اور غیر متوازن سماجیات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فنی شائستگی کے وہ قیمتی اصول گئے وقتوں کا شور معلوم ہوتے ہیں۔ قاسم جلال کے اس سماجی رویے کے بارے میں ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی رائے حقیقت پر مبنی ہے:

''انھوں نے ایک نقاد کی آنکھ سے اس ساری صورت حال کا مشاہدہ کیا ہے اور تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی یہ رائے قائم کی ہے (جو اوپر درج کی گئی ہے) لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس مایوس کن صورت حال کے باوجود وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کی شخصیت کا عمومی مزاج رجائیت پسندانہ ہے۔ وہ روحِ عصر سے مکالمہ کرتے ہیں تو اس کا ایک جواز بھی ہے اور صورتحال کو ڈھب پر لانے کا انداز بھی۔ ان کی نظر میں وہ تمام عصری مسائل بھی ہیں، سماجی، معاشی اور سیاسی حالات بھی ہیں جو اس گھمبیرتا کے ذمہ دار ہیں۔ وہ مقتضیات زمانہ

کو بھی سمجھتے ہیں اور مطالبات عصر کا بھی ادراک رکھتے ہیں اور اپنے تنقیدی مضامین میں اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔"۵

سید قاسم جلال کی تنقید مثبت رویے، صداقتوں کی مثالیت، علمی و فکری وجدان سے مرصّع سوچیں اور ان کی تنقیدات میں گہرائی اور گیرائی کے عناصر سے مرکب ہے اور اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی اور علمی شعور کا بھرپور اظہار کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ گذشتہ چار عشروں سے وہ افقِ ادب پر مثلِ آفتاب ضو فشاں ہیں۔ وہ حریّتِ فکر و عمل کے ایسے مجاہد ہیں جنھوں نے حرفِ صداقت لکھنا اپنا مطمعِ نظر بنالیا ہے۔ چونکہ حق گوئی اور بے باکی ان کا منشور ہے اس لیے وہ کسی مصلحت کی پروا نہیں کرتے۔ ہمارا معاشرہ جن حالات کا سامنا کررہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ڈاکٹر سید قاسم جلال نے معاشرتی زندگی کی بے اعتدالیوں، ناہمواریوں اور تضادات کے خلاف قلم سے جہاد کا آغاز کیا۔ اس کے بعد صحرا میں اذان دینا ان کا معمول بن گیا۔ وہ ادب کی اہمیت، مقصدیت اور اس کی پیش کش سے ادب میں در آنے والی شعوری کشمکش کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں شعر و ادب کی صورت حال پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہمارا معاشرہ آجکل جس طرح سیاسی، سماجی، اقتصادی، اخلاقی اور تہذیبی حوالے سے انحطاط کا شکار ہے اسی طرح شعر و ادب کی فضا بھی بحرانوں کی زد میں ہے۔ آج کا تخلیق کار گھسے پٹے اور فرسودہ موضوعات کو مسلسل دہرائے چلا جاتا ہے۔ اہل قلم کے پاس نہ کوئی فلسفہ حیات ہے نہ کوئی نظام فکر۔ جس ادب میں اپنی تہذیب، معاشرت اور ملی روایات کا عکس ہی نظر نہ آئے وہ کیسے قوم کی سوچوں اور امنگوں کا ترجمان ہو سکتا ہے۔ اردو شاعری کا بنظرِ عمیق جائزہ لیں تو ہمیں ایک طرف وہ بزرگ شعرا ملتے ہیں جن کی شاعری گل و بلبل، کاکل و رخسار، وصل و فراق اور آہ و فغاں کے موضوعات پر مشتمل ہے۔ معاشرتی مسائل اور زندگی کے تلخ حقائق انہیں نظر ہی نہیں آتے۔ دوسری طرف نام نہاد جدت پسند شعرا کی ایک کھیپ نظر آتی ہے۔ جن کا کلام بے مقصدیت، لایعنیت اور بے سروپا خیالات کا مجموعہ ہے۔ ان شعرا نے زبان و بیان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ستم بالائے ستم کہ یہ تنزل پسند شعرا خود کو ترقی پسند بھی کہتے ہیں۔"۶

یہ انتقاد ہمیں معاصر ادبی شعور کا بھرپور اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں کلاسیکی اور جدید شاعری پر ان کا تنقیدی نقطہ نظر واضح ہے۔ وہ شاعری کو معاشرے کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی معاملات کی آئینہ دار اور زندگی کی حقیقتوں کی ترجمان بنانا چاہتے ہیں۔ محض شاعری برائے شاعری یا جدتوں کے باعث لایعنیت کے گرداب میں پھنسے ہوئے مبہم مصرعے ان کے نزدیک شاعری کہلانے کے حق دار نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ

شاعری میں عصری مسائل کا اظہار ہونا چاہیے۔ وہی شاعری با مقصد کہلا سکتی ہے جو مسائل کا حل بھی پیش کرے۔ ان کے نزدیک سماجی، معاشی اور سیاسی حالات پر ہماری شاعری کو اچھا اثر چھوڑنا چاہیے۔ آنے والے عہد کا ذہین قاری جب ہمارے عہد کے شعرا کی شاعری دیکھے گا تو وہ ضرور یہ سوچے گا کہ معاشرے کے مجموعی حالات کا شعراء نے کیا مشاہدہ کیا اور اصلاح احوال کے لیے قوم کو کیا افکار دیے۔ سید قاسم جلال کو اس امر کا بخوبی ادراک ہے کہ دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح شاعری میں مثبت اور منفی تبدیلیاں آئی ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ہر دور کے شعرا مقتضیات زمانہ کے تحت زبان و بیان کے سانچے بدلتے رہے ہیں۔ سماجی، معاشی اور سیاسی حالات موضوعات شاعری پر بھی اثر انداز ہوتے رہے ہیں اور اظہار کے اسلوب میں بھی تغیّر لانے کا موجب بنتے رہے ہیں۔"۷

یوں دیکھا جائے تو قاسم جلال کے ہاں اپنے عہد کی شاعری پر تنقید جو منظر نامہ سامنے لاتی ہے وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ ہماری شاعری کو ہمارے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی معاملات کی عکاسی کرنی چاہیے اور اس میں ہمارے گرد و پیش کی زندگی کے تمام مظاہر دکھائی دینے چاہئیں۔ آج کے انسان کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ، اخلاقی اور روحانی قدروں کا زوال، اُس عہدِ ناپرساں میں انسانیت پر روا رکھے جانے والے مظالم اور وطن پر چھائی ہوئی مایوسی و محرومی کے قیامت خیز سماں کی حقیقی صورت گری یہ سب آج کی شاعری میں شامل ہونا چاہیے۔ وہ محسن احسان کی غزل کا فکری و فنّی جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"خدا کا شکر ہے کہ ادب کی اس حبس زدہ اور مسموم فضا میں اب بھی کہیں کہیں نفع و نقصان سے بے نیاز کچھ ایسے دیوانے مل جاتے ہیں جو تخلیقات کے کشتِ زاروں کو اپنے خونِ جگر سے سینچ کر سدا بہار موسموں سے ہمکنار کرنے میں مصروف ہیں... شاعر کی ذات معاشرے سے الگ نہیں ہوتی۔ اس لیے (شاعر) اپنے جذبہ فکر کا ترجمان بھی ہوتا ہے اور معاشرے کی زبان بھی کہلاتا ہے۔"۸

جہاں شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہوتی ہے وہاں افسانہ بھی زندگی کی کہانی ہوتا ہے اور زندگی کے اس خاص پہلو میں جس پر افسانہ رقم کیا گیا ہوتا ہے اس کے تخلیق کار کے عصری شعور کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں کی افسانوی کاوشوں میں جہاں ایک طرف فرد کی زندگی اور اس کی دل کشیاں رقم ہوتی ہیں وہاں قوم کے مجموعی مسائل اور مصائب کی دل خراش داستانیں بھی ملتی ہیں۔ سید قاسم جلال نے اس تناظر میں رقم کی ہوئی افسانہ نگاری کی رموز کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''کامیاب افسانہ نگار وہی ہوتا ہے جو معاشرتی ماحول کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ سیاسی، ثقافتی اور سماجی مسائل پر غور کرتا ہے اور پھر اپنی خداداد تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لا کر ایسی نگارشات پیش کرتا ہے جو صرف داخلی وخارجی کیفیات کا ہی اظہار نہیں کرتیں بلکہ قاری کی رہنمائی کا فرض بھی ادا کرتی ہیں۔''۹

انھوں نے ۱۹۴۷ء کے واقعے کا تجزیہ کرتے ہوئے گہرے علمی شعور سے اس کے اردو افسانے پر اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے جو اردو افسانے کی عصری صورتِ حال کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''۱۹۴۷ء نے ہماری تہذیبی اور سیاسی زندگی پر ان مٹ اور گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اس سال میں نہ صرف معاشی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں بلکہ اردو ادب پر بھی اس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ برصغیر کی تقسیم خونریز فسادات کا پیش خیمہ بنی۔ اس دور کے بیشتر افسانوں میں فسادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آزادی کے بعد نو آزاد مملکت کے سیاسی مسائل، جذباتی انتشار اور معاشرتی بد امنی کے موضوعات افسانہ نگاروں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ لٹے پٹے ستم زدہ مہاجرین کی آباد کاری اور بے روزگاری کے مسائل ترجیحاً افسانوں کے موضوعات بنے۔''۱۰

یہ تنقیدی بصیرت نہ صرف اس عہد کے افسانوں کے موضوعات کو واضح کرتی ہے بلکہ نقاد کے عصری شعور کا برملا اظہار بھی ہے۔ وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات نے اردو ادب کے افسانہ نگاروں کی ذہنی، نفسیاتی اور سیاسی صورتِ حال کے پس منظر میں تخلیقات پر کس طرح کے اثرات ڈالے۔ فسادات کے افسانوں کے کرداروں سے لے کر خود افسانہ نگاروں کی نفسیات کو سید قاسم جلال نے عصری شعور کے تناظر میں بڑی کامیابی سے اپنی تنقید میں پیش کر کے عصری حسیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تنقیدی شعور معاشرے کی ساخت اور اس کے پسِ پردہ محرک کے طور پر کام کرنے والے عناصر کی نقاب کشائی کرتے ہوئے بہترین عصری شعور کا اظہاریہ بنتا ہے۔ انھوں نے موجودہ مشینی عہد میں انسانوں کے رویوں اور رجحانات کا عمیق نظری سے جائزہ لیا ہے اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کا نوحہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''مشینی عہد کے انسانوں کے اذہان، رویے اور معاملات زندگی بھی مشینی ہو گئے ہیں۔ خود غرضی اور بے حسی نے اخلاص و مروت کے سدا بہار گلستان کو جہنم زار بنا دیا ہے...اخلاقی تربیت کے فقدان، معیشت و معاشرت کے عدم استحکام اور اربابِ اقتدار کی قومی امور سے بے توجہی و بے رغبتی سے ہمارا ملی شیرازہ بکھر کر رہ گیا ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے عوام تمام شعبہ ہائے حیات میں ناکامی و نامرادی سے دوچار ہیں۔ ایک مخصوص طبقہ ان کا

استحصال کرنے میں مصروف ہے۔ جب جائز حقوق کے حصول کی تمام راہیں بند ہو جائیں تو لوگوں کے دلوں میں احتجاجی و مزاحمتی رویوں کا جنم لینا ایک فطری عمل ہے۔"۱۱

سید قاسم جلال جب عصرِ حاضر میں مشینی دور کے انسانوں کے ذہنی رویوں کے باعث معاشرتی ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کو دیکھتے ہیں تو وہ لرز اٹھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہمارے لوگ ذہنی انتشار کے ہاتھوں کہیں برباد نہ ہو جائیں۔ اُنھیں اپنا ملی شیرازہ بکھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ اُن کا عصری شعور ہی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ ہمارا ادب مشینی عہد کے ستم سے باہر نکل آئے۔ اسی باعث اُن کی تنقیدات میں استحصالی طبقے کے خلاف علمی انداز میں شعور اجاگر کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اس کی نظریاتی سرحدوں کی پاسبانی ہو یا جغرافیائی حدود کی حفاظت ان دونوں امور کی طرف ہماری اوّلین ذمہ داری ہے۔ سید قاسم جلال کے لیے حُبِ وطن ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کے یہاں مادرِ وطن نیکی، امن، خیر اور محبت کی وہ جولان گاہ ہے جس پر ہماری تہذیب، صدیوں سے گامزن ہے۔ انھیں اس دھرتی سے چونکہ والہانہ لگاؤ ہے اس لیے ان کی شاعری میں بھی اس سے وابستگی کا رنگ دیدنی ہے ۔ملک کے دولخت ہونے کے سانحے نے ان کے دل و نگاہ کو جس کرب سے دوچار کیا ہے اس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں:

"پاکستان جس طرح تاریخ عالم کے ایک بڑے معجزے کی صورت میں دنیا کے نقشے پر ابھرا تھا اسی طرح اس کا دولخت ہو جانا بھی عالم اسلام کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ اس حادثے کے پس پردہ عوامل میں ایک بڑا عامل اہل سیاست کی منافقت اور ہوس اقتدار بھی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ محسنین پاکستان کی بجائے نااہل سیاست دان کرسئ اقتدار پہ براجمان ہو گئے جنھوں نے مقاصد پاکستان کو دھن، دھونس اور دھاندلی کے زور پر پس پشت ڈال دیا۔ یہ ظالم جاگیر دار، وڈیرے، سمگلر اور صنعت کار ابھی تک پیر تسمہ پا کی طرح قوم کی گردن پر سوار ہیں۔"۱۲

۱۹۷۱ء کو میں ہمارے ملک کا دولخت ہونا ہماری تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ ہر ادیب کی طرح سید قاسم جلال کی تنقید بھی اُس دردمندی سے لبریز ہے۔ اُن کے نزدیک مقاصدِ پاکستان کو جس طرح پس پشت ڈال کر دھونس، دھاندلی اور اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کر کے جس کمینے پن کا اظہار کیا گیا تھا وہ قوم کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھا۔ اُن کے نزدیک وہی سیاستدان اور اُن کی حقیقی و معنوی اولادیں آج بھی پاکستان کے مستقبل سے گھناؤنا کھیل کھیل رہی ہیں۔ کاش ہم اُن کے مکروہ ارادوں اور عزائم کو جان لیں۔ سید قاسم جلال کی عبقری نگاہ اس نکتے کی

وضاحت کرتی ہے اور ہوسِ اقتدار کے حامل ان سیاستدانوں کی منافقانہ رویوں سے ہمیں آگاہ کرتی ہے۔ سید قاسم جلال کی بصیرت ہماری رہنمائی کرتے ہوئے ان کے عصری شعور کی بھرپور ترجمانی کر رہی ہے۔ ان کی تحاریر میں ہم ان کی ملی سوچوں کی آئینہ داری بھی دیکھتے ہیں اور بطور ایک محبت وطن ان کی وطن سے گہری وابستگی کو بھی ملاحظہ کرتے ہیں۔ وہ بلاشبہ اس دھرتی کو شاداں و فرحاں دیکھنے کے تمنائی ہیں۔

ایک حساس تخلیق کار کی حیثیت سے ان کا تجزیہ مادر وطن کے درد سے لبریز ہے۔ ہم ان کے علمی اور عصری شعور کے زاویوں سے اپنے قومی انحطاط کی تصویروں کو بھی ملاحظہ کرتے ہیں اور ان اسباب و علل سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں جو قومی نقصانات و سانحات کی بنیادیں ہیں۔ سید قاسم جلال نے اس سب کا تجزیہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ ان مسائل کے حل کی راہ بھی دکھائی ہے۔ جس کا اظہار ان کی تنقیدات میں بہت نمایاں ملتا ہے۔

سید قاسم جلال ایک حساس تخلیق کار اور نقاد کی حیثیت سے اپنے گرد و پیش کے معاملات اور مسائل کو دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح ہمارا یہ معاشرہ جنت بداماں بن جائے۔ اس تناظر میں وہ ایک استاد کی طرح اس قوم کو تعمیر و ترقی کا درس دیتے ہیں اور اس کی اصلاح کے لیے اپنے عزم صمیم کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں جو مسائل یا تنازعات اس راہ میں رکاوٹ کا باعث بن سکتے ہیں ان کی نہ صرف نشاندہی کرتے ہیں بلکہ عصری شعور کی روشنی میں وہ اس کا حل بھی سوچتے ہیں۔ ان کی رائے کے مطابق:

”آج کا انسان جن سنگین، تلخ اور اذیت ناک مسائل کا شکار ہے ان کا تذکرہ بھی زہرہ گداز و روح فرسا ہے۔ ہر شخص کی آنکھ پر خود غرضی، حرص اور ہوس کی پٹی بندھی ہے۔ اپنوں میں اپنائیت کا فقدان ہے۔ اخلاص کے دعوے دار فریب کاریوں میں مصروف ہیں۔ مقدس رشتوں کو پامال کیا جا رہا ہے۔ نہ اولاد کو والدین کے دکھ درد کا احساس ہے نہ شاگرد کو استاد کی عزت کا لحاظ۔ حفظِ مراتب کا ادراک رکھنے والے قبروں میں جا سوئے۔“ ۱۳

رشتوں کی نزاکتوں اور کھرے پن میں کھوٹ اور خود غرضی کے زہر ہلال کے شامل ہو جانے کے باعث معاشرہ جس طرح کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ سید قاسم جلال بڑی دردمندی سے نہ صرف اس کا تجزیہ کرتے ہیں بلکہ اس کے اسباب کا ناقدانہ جائزہ بھی لیتے ہیں۔ آج کے معاشرے کے خدوخال اجاگر کرتے ہوئے سید قاسم جلال لکھتے ہیں:

”یہ دور کم ظرف عیاری کو ہشیاری، منافقت کو مصلحت پسندی اور سادگی کو حماقت کا نام دیتا ہے۔ قول و فعل کا تضاد اور ظاہر و باطن کی دورنگی کامیابی کے زینے سمجھے جاتے ہیں۔ اہل قلم کی تحریریں جھوٹ اور مبالغہ آرائی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ میر جعفر اور میر صادق آستینوں میں خنجر چھپائے قوم کے محسنوں پر حملہ آور ہو رہے

ہیں۔ پارسائی کے روپ میں مکر و شیطنت کا کاروبار عروج پر ہے... منافقانہ فضا میں پرورش پانے والے ظلمت شب کو جلوہ سحر اور عہد جبر و ستم کو دور امن وسکوں کہتے ہیں۔"۱۴

مندرجہ بالا اقتباس میں سید قاسم جلال نے عصرِ رواں کے انسانوں کے مجموعی، علمی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی رویوں کے حوالے سے بڑی دردمندی کا اظہار کیا ہے۔ وہ معاشرے میں نفوذ کر جانے والے قول و فعل کے تضاد کو دورنگی اور منافقت کہتے ہیں جو ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح کھارہی ہے اور قوم کے محسنوں کو ذلیل ورسوا کیا جارہا ہے۔ جلد یا بہ دیر یہ ملت اس کا خمیازہ بھگتے گی۔ کیا یہ ایک ملی درد رکھنے والے نقاد کی عصری حسیت کا برملا اظہار نہیں؟ کیا اس کے لفظ لفظ میں اپنے عہد کی منافقت اور ظاہر و باطن کی خباثتوں پر طنز نہیں کیا گیا؟ کیا منافقانہ فضا اور عہد کو بدل دینے کی آرزو کا گہرا رنگ اس تنقید میں موجود نہیں؟ بلاشبہ یہ قاسم جلال کے عصری شعور کی آئینہ داری ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تنقید میں ایمان داری اور راست گوئی کی اس روایت کے امین سید قاسم جلال ہیں۔ وہ بدلتے ہوئے عصری رویوں کی بھرپور غمازی کرتے ہیں۔ مدلل مداحی سے کوسوں دور سید قاسم جلال کی تنقید جہاں ادب اور ادیب کے ذمہ دارانہ رویے کی متقاضی ہے وہیں وہ ادب سے فلاحِ معاشرت اور عصر حاضر سے حق گوئی کی روایت کا احیاء بھی چاہتی ہے۔ یہی ایک زندہ معاشرے کے نبّاض نقاد کی ذمّہ داری ہے اور سید قاسم جلال اپنی اس ذمّہ داری سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں اور اردو تنقید میں اُن سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ حسرت کاس گنجوی، سید قاسم جلال کے تنقیدی مقالات، مضمون مشمولہ: کھوج پرکھ' از ڈاکٹر سید قاسم جلال، لاہور، گڈ بکس پبلشرز، ۲۰۰۵ئ، ص ۷

۲۔ عبدالکریم خالد، ڈاکٹر، ایک جواں فکر نقاد۔ سید قاسم جلال، مضمون مشمولہ: توجیہ و توضیح' از ڈاکٹر سید قاسم جلال، کراچی، جبران اشاعت گھر، ۲۰۱۴ئ، ص ۱۳

۳۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، توجیہ و توضیح: ایک جائزہ، مضمون مشمولہ: توجیہ و توضیح، ص ۲۴، ۲۳

۴۔ سید قاسم جلال، ڈاکٹر، توجیہ و توضیح، کراچی، جبران اشاعت گھر، ۲۰۱۴ئ، ص ۵۳

۵۔ ایضاً ۲۔ ص ۱۹

۶۔ سید قاسم جلال، ڈاکٹر، کھوج پرکھ، لاہور، گڈ بکس پبلشرز، ۲۰۰۵ئ، ص ۱۱۱

۷۔ سید قاسم جلال، ڈاکٹر، توجیہ و توضیح، ص ۵۳

۸۔ ایضاً، ص ۶۸، ۶۹

۹۔ ایضاً، ص ۱۰۶، ۱۰۷

۱۰۔ سید قاسم جلال، ڈاکٹر، کھوج پرکھ، ص ۴۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۱۲۔ سید قاسم جلال، ڈاکٹر، توجیہ و توضیح، ص ۸۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۴، ۴۳

۱۴۔ سید قاسم جلال، ڈاکٹر، کھوج پرکھ، ص ۱۲۵